© rasailojaraid.com

مسلم شناخت

اور مغربی معاشرہ

سائیو بھان ملکی

سائیو بھان ملکی، یونیورسٹی کالج ڈبلن آئرلینڈ میں پی ایچ ڈی کی طالب علم ہیں۔ ایک طالب علم کی حیثیت کے ساتھ ساتھ بہت سے تحقیقی اداروں میں خدمات انجام دے چکی ہیں۔

ترجمہ: اشرف طارق

یورپ میں اسلام کے ماننے والے اقلیت میں ہیں، تاہم مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس اضافے کے ساتھ مسلم شناخت کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس پس منظر میں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ یورپ کی نئی ظاہری صورت کے حوالے سے وہاں مسلمانوں کی تعداد میں اس اضافے کو کس طرح لیا جا رہا ہے۔ مسلمان دیگر مذہبی گروہوں کی طرح مختلف قومیتوں، سماجی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے معاشی حالات بھی مختلف ہیں۔ مگر یورپ میں موجود ممالک میں مسلمانوں نے اسلام سے وابستگی کی بناء پر اپنی ایک مشترک برادری قائم کی ہے۔ ان کا مذہب ان کی شناخت ہے۔ شناخت ہم سب کی زندگیوں کا بنیادی جزو ہے۔ ہم میں سے ہر ایک وفاداریوں، تعلقات، اعتقادات اور ذاتی نقطہ ہائے نظر کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ تاہم کئی لوگوں کے لیے شناخت کا مسئلہ شاذ و نادر ہی ذاتی تصادم یا پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے کیونکہ تسلیم شدہ قومیتوں کے اندر لوگ یکساں اعتقادات اور نقطہ ہائے نظر کے حامل ہوتے ہیں۔ چند دوسرے لوگوں کے لیے خاص طور پر ان کے لیے جو منتشر قومیتوں کی صورت میں رہتے ہیں یا اقلیت ہیں یا دھتکارے ہوئے گروہوں کی صورت میں رہتے ہوں، ان کے لیے یہ ایک ایسا سوال ہوتا ہے جو تمام زندگی ان کے ذہنوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں مغربی معاشرے کے اندر شناخت کے حوالے سے وضاحت کی گئی ہے کہ کسی لبرل جمہوریت میں ایک فرد کو اپنی شناخت تسلیم کرانے کے لیے کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان جمہوری معاشروں میں پائی جانے والی اقلیتوں کے مسئلے پر بات کی گئی ہے، خاص طور پر ایک ایسے مذہبی گروہ کا ذکر یورپی تناظر میں کیا گیا ہے، جسے مسلمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لبرل جمہوریتیں اور اقلیت

جدید دنیا میں بہت سے لوگ جمہوریت کے تصور سے اتفاق رکھتے ہیں، جس میں فرد کے حقوق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جدید دنیا قومی ریاستوں سے تشکیل پاتی ہے اور ہر قومی ریاست کی اپنی اپنی سرحدیں ہیں۔ قومی ریاست کے اندر عموماً متنوع ثقافتوں، مذاہب اور قبائلی شناختوں کے لوگ رہتے ہیں۔ قومی ریاست کے ارتقا کی وجہ سے وفاداریوں کا رخ قبائلی ثقافتی پہلو سے ہٹ کر قومی پہلو کی طرف ہوگیا ہے۔ پاریکھ (Parekh) وضاحت کرتے ہیں کہ ''قومی ریاست وجود میں آنے سے عرصہ دراز سے موجود گروہوں کا خاتمہ ہوا اور آزاد افراد مقتدرہ کی مجموعی طور پر قابل قبول اور مرکزی ساخت کے اندر متحد ہوگئے''۔

بتدریج، ثقافتی اور مذہبی شناخت رکھنے والے گروہوں کی طاقت قومی

> اگر مسلمانوں کو کسی ملک میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے تو اس ملک کو دارالحرب نہیں سمجھا جا سکتا

ریاست کے اندر شامل ہوگئی جبکہ اس ریاست کے اندر افراد ایک اہم اکائی بن گئے اور کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ یہ گروہ اب طاقت کے غالب ذرائع کے طور پر وجود نہیں رکھتے۔ تاہم، کوئی بھی ارتقائی عمل سادہ اور سیدھا نہیں ہوتا اور مختلف حالات و واقعات کے تناظر میں قومی ریاست، گروہ اور انفرادی شناختوں کے درمیان تعلق، پیش رفت کے مسلسل تبدیل ہونے والے تناسب اور توازن کی پیچیدگیوں کو واضح کرتا ہے۔

اگرچہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی کہ ہم فرد کی مرکزیت پر قائم، جمہوری اور قومی طور پر متعین معاشرے میں رہیں، تاہم کسی مجموعی معاشرے اور اس کے حصوں کے درمیان تصادم کی بہت سے مثالیں موجود ہیں جہاں مذہبی اور ثقافتی شناختیں مقدم رہتی ہیں اور قومی شناخت پر ترجیح اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ تصادم کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس بات کا جواب کسی نہ کسی حد تک وان ہرڈر (Wan Herdor) کی وضاحت میں موجود ہے جس کے مطابق ہر فرد کے دل میں تعلق رکھنے کی خواہش بنیادی طور پر پائی جاتی ہے۔ مارگلٹ (Margalit) نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کسی کلچر سے قرب اور ہم آہنگی اور ان حدود کا تعین کرتی ہے جو قابل تصور ہیں''۔ کسی فرد کی طرف سے کسی کوشش یا کارنمایاں کے بغیر بھی کوئی شخص گروہ کا حصہ ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے خود شناختی کا ایک بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اسی 'تحفظ' کے سہارے کوئی شخص ''آزاد دنیا'' میں خطرات کا مقابلہ کرتا ہے۔ جز سے کل کی جانب اس حرکت کے لیے کسی کشش، تعلق اور وابستگی کا ہونا ضروری ہے جس سے کامیابی کے ساتھ اس گروہ میں ضم ہونے کے لیے ضروری اعتماد کا حصول بھی ممکن ہوتا ہے۔

شناخت اور قومی ریاست کے حوالے سے کیا اس نکتے پر بحث کی جا سکتی ہے کہ قومی ریاست کی تشکیل کا مطلب یہ تھا کہ ان کی سرحدوں کے اندر رہنے والے تمام لوگ اپنی وفاداری کسی ایک قومیت یا گروہ کے ساتھ رکھنے کے پابند ہیں؟ دور حاضر کی اقوام کی اکثریت کی طرف سے اس کا جواب صاف ''نہیں'' ہے کیونکہ تمام حدود اور سرحدیں مصنوعی طور پر بنائی گئی تھیں لہٰذا ان خطوط کے اندر رہنے والے تمام اشخاص کے اندر مشترکہ صفات یقینی بنانے کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ مشترکہ صفات افراد سے وابستہ عوامل کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، جن کا قوم کے تمام ارکان میں موجود ہونا ضروری نہیں۔ مشہور دانشور مالوف (Maalouf) کے مطابق ہر شخص کے اندر ''فطری طور پر پیچیدہ شناخت'' ودیعت کی گئی ہے جو زبان، اعتقادات، طرز زندگی، خاندانی تعلقات، فنون لطیفہ اور خورد و نوش کے ذوق، فرانسیسی، یورپی اور مغربی اثرات، اور اسی طرح کے کئی دیگر پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر فرد کو آزادانہ انداز سے رہنے دیا جائے اور اسے اپنی ذات کے اندر موجود تنوع کو سمجھنے کا موقع دیا جائے تو یہ گوناگوں وابستگیاں ایک شخص کے لیے اہم مگر خوشگوار تجربہ بن جاتی ہیں''۔ تاہم شناخت کے مسائل اس وقت پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب ایک مخصوص وابستگی دیگر تمام وابستگیوں پر غالب آ جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک اقلیتی گروہ اس بالادست وابستگی کی وجہ سے نمو پاتا ہے۔ قومی ریاست میں اقلیتی گروہوں کو ضم کرنے کے مسئلہ سے نپٹنا بہت پیچیدہ معاملہ ہے، کیونکہ کئی پہلوؤں مثلاً قانونی، مذہبی، سماجی، لسانی اور ثقافتی کو زیر غور لانا پڑتا ہے۔ بین الاقوامی طور پر اقلیتوں کے حقوق کو یقینی بنانے کے لیے قانونی لحاظ سے چند ایک اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ بین الاقوامی میثاق برائے شہری و سیاسی حقوق کا آرٹیکل نمبر ۲۷ قرار دیتا ہے کہ ''ان ریاستوں میں جہاں نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیتوں کا وجود ہے، ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کو، اجتماعیت میں ان کے گروہ کے دیگر ارکان کے ساتھ، اپنی ثقافت سے استفادہ کرنے، اپنے مذہب کو ماننے اور اس پر عمل کرنے یا اپنی زبان استعمال کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا‘‘۔

لہٰذا، اقلیت کو اگر وجود واحد تصور کیا جائے تو اس کے حق کا احترام لازم ہے۔ تاہم، لبرل معاشروں میں اقلیتی ثقافتوں کے بارے میں علمی شخصیات کے درمیان کچھ عدم اتفاق ہے۔ مثال کے طور پر کملیکا (Kymlica) جو اپنے آپ کو لبرل خیال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ’’اقلیتی گروہوں کی حفاظت بطور گروہ کی جانی چاہیے اور یہ کہ تنازعات کے ساتھ داخلی طور پر ہی نپٹا جانا چاہیے‘‘۔ والزر (Walzer) اقلیتی ثقافتوں کے مسئلے پر بحث کو ایک قدم مزید آگے لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ’’معاشرتی سطح پر ثقافتی شناخت کی نہ حمایت کرنی چاہیے نہ ہی قابل سزا قرار دینا چاہیے۔ اس کی بجائے ثقافتی شناختوں کے اظہار اور پیشرفت کے مسائل کو نجی حلقہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیشہ بہترین حل ثابت نہ ہو جیسا کہ مغربی لبرل جمہوریتوں مثلاً برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس کی مثالوں سے زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے‘‘۔

ترک وطن، اقلیتیں اور شناخت

جیسا کہ واضح کیا گیا ہے، تناؤ پیدا ہونے کا امکان وہاں موجود ہے جہاں ایک قومی ریاست میں مختلف گروہی وابستگیاں پائی جائیں جیسا کہ لبنان، بھارت اور سوڈان میں ہے۔ ترک وطن کی صورت میں صورتحال مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے جہاں ایک قیام پذیر اور واضح طور پر متعین قوم یا معاشرے کو، جس کی اپنی واضح شناخت ہوتی ہے، ایسے گروہوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے جو اپنی نئی شناخت کے ساتھ اجتماعیت کا حصہ بنتے ہیں۔ اس اقلیتی کلچر کی وجہ سے نئے مسائل جنم لیتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب اس قوم کا اقلیتی گروہوں کے ساتھ پہلے سے کوئی تجربہ نہ ہو۔ نئے تارکین وطن کی اپنی شناخت اور اعتقادات ہوتے ہیں۔ وہ دیگر تارکین وطن کے ساتھ نسل، مذہب یا زبان ایک ہونے کی وجہ سے شناخت قائم کر سکتے ہیں۔ تارکین وطن قوم کے پہلے سے موجود شہریوں کے ساتھ بھی اپنا تعلق قائم کر سکتے ہیں اور برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں پر شناخت تارکین وطن کی اس حیثیت سے ہو رہی ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں، بجائے اس کے کہ شناخت انہیں کچھ سمجھتے ہوئے قائم کی جائے۔ ایک دانشور یووِل ڈیوِس (Yuval Davis) ہمیں بتاتی ہیں کہ: ’’ثقافتی طور کوئی ’دوسرا‘ یعنی ترک وطن کرنے والا یا کسی دوسرے گروہ کا رکن جو ایک مشترک نسل ہونے کی ساجھی روایت نہیں رکھتا، اجنبی کہلائے گا، لہٰذا وہ ایک ممکنہ ’دشمن‘ ہے جو ہماری قومی اور ثقافتی سالمیت اور ہم آہنگی کے لیے خطرہ ہوسکتا ہے‘‘۔

مالوف (Maalouf) وضاحت کرتے ہیں کہ ’’لوگوں میں اپنے آپ کو اس وابستگی کے ذریعے تسلیم کرانے کا رجحان ہوتا ہے جس کو سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا جائے۔ وہ وابستگی جو تنقید کا باعث بنے مثلاً رنگ، مذہب، زبان، طبقہ وغیرہ، مجموعی شناخت پر حملہ آور ہوتی ہے۔ وہ متاثرہ

مسلم خاتون اور نئی تمدنی ضروریات

لوگ اس وابستگی کو اپناتے ہیں، یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں، آپس میں ملتے ملاتے ہیں، اکٹھے ہو کر آگے بڑھتے ہیں، ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور طرف داری کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنی شناخت کا اعتراف کرنے کا عمل لازمی طور پر ایک جرأت کا کام اور ایک آزادی کا فعل ہوتا ہے‘‘۔

یووِل ڈیوِس (Yuval Davis) کسی علاقے سے تعلق کو بھی زیر بحث لاتی ہیں۔ تعلق کا احساس ایک نظر نہ آنے والی شے ہے مگر یہ جذبہ ناقابل یقین حد تک مضبوط ہوتا ہے۔ وہ مزید تبصرہ کرتی ہیں کہ محض شہریت کے اندر ایک دوسرے سے تعلق کا احساس چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کا آغاز ان نسلی رشتوں سے ہوتا ہے جن کے ذریعے نئے تارکین وطن اپنے ثقافتی اور سماجی گروہوں کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر ایسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سماجی حالات نہ پائے جائیں تو پھر ایک اور قسم کی وابستگی ترجیح حاصل کر لیتی ہے جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے مذہب ایک ایسی وابستگی بن چکا ہے جو مختلف سماجی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے افراد کو رابطہ میں لے آتا ہے خواہ ان کا تعلق مصر، ایران، بلغاریہ، فلسطین، پاکستان اور ترکی سے ہو۔ یہ تعلق سیاست کا شکار اس وقت ہو سکتا ہے، جب اسے خطرہ لاحق ہو۔ ایک ایسا خطرہ جو نہ صرف مستحکم اقلیتی گروہوں کو بھی ہو سکتا ہے مثلاً آسٹریلیا کے ابتدائی باشندوں کو، بلکہ ترک وطن کرنے والے گروہوں کو بھی مثلاً برطانیہ میں موجود پاکستانی اجتماعیت کو بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اگر تارکین وطن کو معاشرے کا حصہ بنانا ہے تو حکومت یا ریاست کو سمجھنا چاہیے کہ شناخت ایک کثیر پہلو رکھنے والی ذہنی سوچ کا نام ہے اور یہ کہ لوگ اپنے گروہ کے اندر بھی وفاداریاں رکھیں گے اور مجموعی طور پر عام لوگوں سے بھی۔ بطور شہری ریاست سے وفاداری اس شناخت کا صرف ایک جزو ہوتی ہے اور ریاست کو یہ وفاداری جیتنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ جبر سے حاصل کی جائے۔

> مسلمانوں کو انفرادی طور پر اور آزادی کے ساتھ اپنی عقل، آزادی اور تخیل کا استعمال کر کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ سماجی اور سیاسی طور پر ان کی ذمہ داری کیا بنتی ہے۔

ہابرماس (Habermas) کے مطابق ''شہریت دینے والی قوم، آزادی کے عمل کو صرف اپنی ریاست کے لیے وفاداری حاصل کرنے کے بعض طریقوں کو فروغ دے کر برقرار رکھ سکتی ہے، ایک ایسی وفاداری جسے قانونی طریقوں سے نافذ نہیں کیا جا سکتا''۔

ترک وطن کرنے والوں کی وفاداری جیتنے کے لیے کسی ریاست کو چاہیے کہ وہ انہیں تسلیم کرے، بحیثیت افراد اور اپنی اجتماعیت کے حصہ کے طور پر بھی۔ تسلیم کرنے کا عمل نہ صرف کسی نئے اقلیتی گروہ کو زیادہ محفوظ بناتا ہے بلکہ یہ ایک بنیادی انسانی ضرورت اور جمہوریت کے لیے ضروری ہے جیسا کہ سیگلو (Seglow) نے وضاحت کی ہے: ''صرف دوسروں کی طرف سے محفوظ طور پر تسلیم کیے جانے کے عمل کے ذریعے ہی انسان اپنی ذات کے ساتھ مناسب تعلق استوار کرنے کے قابل ہوتے ہیں''۔ ٹیلر (Taylor) اقلیتی طبقات کو مذاکرات کے عمل کے ذریعے تسلیم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے معاشروں میں عزت کے تصور کا حوالہ دیتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں کہ قدیم دور میں عزت کا انحصار سماجی نظام مراتب اور عدم مساوات پر ہوتا تھا۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اب ہم عظمت کا ایک جدید تصور رکھتے ہیں، ایک ایسا تصور جسے ہر کوئی مانتا ہے اور صرف یہی تصور جمہوری معاشرے سے ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا ہمارے ہم عصر بدلتے ہوئے معاشروں میں کھلے مذاکرات کی ضرورت ہے۔ مذاکرات کے ذریعے ہم تمام طبقات کے لیے عظمت کا احساس حاصل کر سکیں گے اور ایک جاندار کثیر الثقافت معاشرے میں رہنے کے قابل ہوں گے۔

اقلیتی طبقات اور پہچان

سیگلو (Seglow) اقلیتی گروہوں کے لیے دو اقسام کی شناخت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلی قسم کو وہ ''محدود شناخت'' (narrow recognition) کا نام دیتے ہیں، جس سے مراد اقلیتی گروہ کو نئے قوانین کی صورت میں کچھ تحفظ یا خود مختاری دینا ہے۔ ناقدین مثلاً باری (Barry) کہتے ہیں کہ اس قسم کی شناخت فرد کو آزادی سے محروم کر دیتی ہے اور کسی معاشرے میں قبائلی رجحانات پیدا کرتی ہے۔ یہ آراء ایسی اقوام میں صحیح سمجھی جا سکتی ہیں جنہوں نے اپنی بنیاد لبرل ازم، انفرادیت پسندی کے عمرانی نظریہ اور جمہوریت پر رکھی ہو۔ سیگلو (Seglow) اس تنقید کو تسلیم کرتے ہیں اور محدود پہچان کے نظریہ کا موازنہ پہچان کی دوسری قسم سے کرتے ہیں، جسے ''وسیع پہچان'' (wide-recognition) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وسیع پہچان کا وجود اس وقت ہوتا ہے جب کسی خاص اقلیت کے بارے میں عوامی طور پر قبول اور تسلیم کر لیا جائے کہ دنیا کے بارے میں اس کا اپنا مخصوص نقطہ نظر اور رائے ہے خواہ وہ اکثریت سے مختلف ہو۔ اس قسم کی پہچان کا تقاضا ہے کہ کسی خاص ریاست کے تمام شہری ایک دوسرے کا اور اپنی باہمی شناختوں کا احترام کریں۔ سیگلو کہتے ہیں کہ کسی گروہ کی مجموعی شناخت کے حصول کے لیے ان دونوں اقسام کی شناختوں کی بقائے باہمی کا ہونا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی شہر میں ایک مسلم سکول کا قیام محدود پہچان سمجھا جائے گا، مگر جب تک مسلم گروہ کو عوام معاشرے میں تسلیم نہیں کر لیتے یعنی وسیع پہچان نہیں دے دیتے اس وقت تک سکول کا قیام ناراضگی پیدا کرنے کا باعث ہو گا اور اس کی وجہ سے برے اثرات پیدا ہونے کا خدشہ موجود رہے گا۔

والزر (walzer) گروہوں کے حقوق اور ان کی پہچان پر تنقید کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے کہتے ہیں کہ "ریاست اور نسل پرستی کے درمیان شدید فاصلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس صورتحال کو وہ عدم امتیاز کا ماڈل کہتے ہیں۔

اس ماڈل کا نفاذ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں والزر کے مطابق "نئی دنیا" میں موجود کثرت کے نظریہ کے مطابق بڑی کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس ماڈل میں ترک وطن کرنے والے گروہوں کی جانب سے اس مقصد کے مطابق رضا کارانہ حرکت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ نئے معاشرے میں ضم ہو جائیں۔ گلیزر (Glazer) اتفاق کرتے ہیں کہ یہ ماڈل بعض حالات و واقعات میں مناسب ثابت ہو سکتا ہے مثال کے طور پر اس وقت جب حکومت کا مقصد "مختلف گروہوں کو واحد قومی کلچر میں ضم کرنا ہو جس کی مشترک زبان، ایک تاریخ اور سیاسی ادارے بھی مشترک ہوں"۔ اس کے برعکس والزر (walzer) گروہوں کے حقوق کے ماڈل کی تجویز دیتے ہیں، ان کے خیال میں "اگر کوئی معاشرہ اس تصور کے مطابق قائم ہو کہ یہ گروہ کا ایک وفاق کہلائیں اور ان کی رکنیت مرکزی اور مستقل ہو اور یہ کہ گروہوں کے درمیان پائی جانے والی تقسیم کے عمل اس طرح ہوں کہ ان گروہوں کی شناختوں کو کمزور تصور کرنے کا عمل غیر حقیقی یا غیر منصفانہ قرار پائے اور یہ کہ وقت گزرنے پر انہیں مشترک شہریت عطا کر دی جائے"۔

یورپ گروہوں کو حقوق دینے اور کثیر الثقافتی کا راستہ اپنانے کی کوشش میں مصروف ہے، مگر اصطلاحات مثلاً کثرت، کثیر الثقافتی، انضمام اور ادغام کا درست مفہوم مقرر کرنے میں مشکلات درپیش ہیں۔

کثرت، کثیر الثقافتی اور مختلف اکائیوں کا انضمام

مشہور علمی شخصیت والڈرن (Waldron) کے مطابق جدید معاشرے کے اندر کثرت کا ہونا ایک ناگزیر پہلو ہے۔ اگر کثرت ایک حقیقت ہے تو ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے اور ہمیں ممکنہ حد تک ایک متحرک معاشرے کی تخلیق کرنے کے لیے کام کرنا چاہیے تا کہ ایک کثیر الثقافت معاشرہ وجود میں آ سکے جس میں مختلف طبقات کا باہم ضم ہونا ممکن ہو۔ کثرت کا قبول کیا جانا مشکل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ثقافتوں کے اندر بھی لوگ مختلف لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت یہ ہے کہ افراد کو اپنے اندر بھی خاص ماحول میں پرورش پانے، سماجی حیثیت یا تعلیم کی بنا پر فائق ہونے کی وجہ سے کثرت کا تجربہ ہوتا ہے۔ تاہم ہرڈر (Harder) اور مارگالٹ (Margalit) کے خیال میں افراد اس کے باوجود بھی اپنی شناخت کسی وسیع "مشترک کلچر" کے ساتھ کراتے ہیں۔ یہ بات ان ثقافتوں یا گروہوں کے بارے میں خاص طور پر درست ہے جن کا "گہری وابستگی پر منحصر مربوط فلسفہ یا اقدار کا نظام ہو"۔ یہ بات یورپی اقوام اور دین اسلام پر صادق آتی ہے۔

آج کل دو قسم کی کثرت (Pluralism) کی شناخت کی جا سکی ہے: یعنی وضاحتی کثرت (descriptive pluralism) اور نظری کثرت (normative pluralism) وضاحتی کثرت سے مراد کسی معاشرے میں مخالف ثقافتی اعتقادات کے لیے محدود احترام کا پایا جانا ہے یعنی کہ معاشرے میں موجود لوگ مختلف ثقافتی عناصر سے آگاہ ہیں مگر وہ اپنے آپ کو ان کے نفاذ کا پابند نہیں سمجھتے۔ مختلف کلچر مشترکہ بھلائی کی

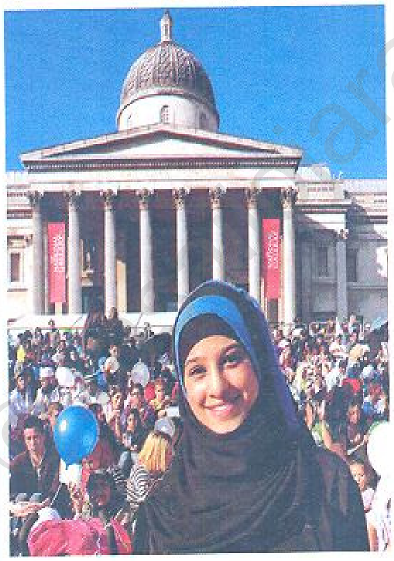

مغربی معاشرے میں مسلم شناخت

تلاش میں ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ان کے درمیان ایک مشترک سبب پایا جائے اور اس کے حصول کے لیے لوگوں کو سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اس مقصد کا حصول یورپی اقوام میں اس لیے مشکل ہے کہ لوگوں کو کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اندر ان لوگوں کو جگہ دینے کے لیے تبدیلیاں لائیں جو حال ہی میں معاشرے میں آ کر شامل ہوئے ہیں۔
تاہم اگر مشترک سبب دستیاب ہو جائے تو اس سے مراد یہ ہو گی کہ مختلف ثقافتی عناصر اور مختلف طبقات اپنے نمایاں ثقافتی پہلو برقرار رکھتے ہوئے ایک فطری کثیر الثقافت معاشرے کی صورت میں بقائے باہمی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

دوسری قسم کی کثرت نظری کثرت سے تعبیر کی جاتی ہے جس کا مطلب تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثقافتی عناصر کے لیے غیر محدود اور غیر مشروط احترام ہے۔اس میں ہر چیز قابل قبول ہوتی ہے اور کسی بھی چیز کو ثقافتی طور پر 'غلط' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر آئرلینڈ تسلیم کرلے کہ خواتین کا ختنہ ایک ثقافتی رسم ہے لہٰذا اس رسم پر عمل کرنے دیا جائے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہریوں کو اسلحے تک رسائی ہر اس وقت حاصل ہو جب وہ مناسب سمجھیں۔ جیسا کہ ان مثالوں سے اشارہ ملتا ہے نظری کثرت واقعتاً قابل عمل نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کسی معاشرے کے بنیادی حقوق اور قوانین میں مداخلت ہونے لگتی ہے۔ کثرت کی اس قسم میں ثقافتی پہلو کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود نہیں لہٰذا اس میں یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ کسی بھی قسم کا کلچر محض کلچر کی تعریف پر پورا اترنے کے لحاظ سے تو صحیح ہے، مگر اس تعریف سے کوئی بھی شخص یہ تصور قائم کرسکتا ہے کہ ایسا معاشرہ کثرت کی اس قسم پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے کچھ عرصے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان ثقافتی پہلوؤں سے اوپر بھی اصولوں یا قوانین کا مجموعہ ہونا چاہیے تا کہ ایک پائیدار معاشرہ وجود میں آ سکے۔ ''ایک معاشرے کو قائم رہنے کے لیے اتحاد کی قدر کو بالآخر کثرت کی قدر پر فوقیت دی جانی چاہیے۔'' لہٰذا کثرت، بنیادی اقدار مثلاً صحت، رہائش اور تعلیم کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کی حامل ہونی چاہیے۔اس سے یہ بھی مراد ہے کہ اختلافات قبول کیے جائیں اور یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ بعض اوقات اعتقادات بھی ناسازگار ہو سکتے ہیں اور یہ کہ اس مسئلے کا حل تلاش کیا جانا چاہیے۔

اسی بحث میں اہم سوال یہ بھی ہے کہ کسی اقلیتی گروہ کا اکثریتی کلچر میں ضم ہونے، خاص طور پر مسلمانوں کا یورپی معاشروں میں ضم ہونے کا کیا مفہوم ہوگا؟ انضمام سے مراد ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ''ایک اقلیت بعض ثقافتی پہلوؤں کی قربانی دیے بغیر مساوات کے حصول میں کامیاب ہو جائے۔'' اسے ادغام کا متضاد سمجھا جا سکتا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ ''اقلیت کا آخر کار اکثریت میں گھل مل جانا''۔ ہالینڈ میں نومبر ۲۰۰۴ء میں انضمام کی پالیسی کے بارے میں ہونے والی ایک کانفرنس میں محترمہ ایم سی ایف ورڈونک (Verdonk) جو کہ ہالینڈ کی وزیر برائے امیگریشن و انگریشن ہیں، انہوں نے انضمام کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''اس معاشرے میں حصہ لینے اور شرکت کرنے کی خواہش جس میں آپ رہتے ہوں۔'' میرے خیال میں جب ہم انضمام کے بارے میں کوئی تصور قائم کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انضمام محض اقلیت یا ہجرت کرنے والے گروہ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تمام معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ وہ تعریف جو مقصد کو بہت زیادہ پورا کرتی ہے اور جو تمام مذکورہ بالا پہلوؤں کو احاطہ کرتی ہے یورپین کونسل برائے پناہ گزین وجلاوطنی (ECRE) نے اپنی ویب سائٹ پر رکھی ہے۔ ان کے مطابق انضمام ایک متحرک اور دو طرفہ عمل ہے: یہ طریقہ کار استقبال کرنے والے معاشروں اور افراد اور/ یا متعلقہ گروہوں کو اپنی ذمہ داریاں پورا کرنے پر زور دیتا ہے۔'' جہاں تک تارکین وطن یا اقلیتی گروہوں کا تعلق ہے ''ضم ہونے کا عمل میزبان معاشرے کے طرز زندگی کے مطابق اپنی کلچرل شناخت کو کھوئے بغیر اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے ذہنی تیاری کا نام ہے''۔ میزبان معاشرے کے ضمن میں انضمام تقاضا کرتا ہے کہ ''سرکاری اداروں کو آبادی کے خدوخال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معروف کرکٹر شاہد آفریدی یورپ میں اپنی فیملی کے ساتھ

کے مطابق ڈھالنے، پناہ گزینوں کو قومی برادری کے حصے کے طور پر قبول کرنے اور وسائل تک رسائی میں سہولت پیدا کرنے اور فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کرنے کے لیے رضامند ہو۔"

مذہبی مسائل اور مذہبی اقلیتیں

گروہوں کو اقلیتوں میں مختلف حالات کی وجہ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسا نسل، ثقافتی اعتقادات، زبان کے خدوخال اور مذہبی اعتقادات کے مشترک ہونے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی مذہبی گروہ کے اراکین میں مشترک روحانی اعتقادات کے علاوہ کچھ اور مشترک نہ ہو۔ تاہم، وسیع پیمانے پر ترک وطن کرنے اور شناخت کی تلاش کی وجہ سے کوئی بھی مشترک پہلو لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتا ہے۔ ایسا یورپ میں ہوا ہے، جہاں ایک فرد جب بہت سی ثقافتوں، مذاہب اور سماجی اعتقادات کے تنوع میں پہنچتا ہے تو ایسے میں وہ دیگر نئے آنے والے لوگوں میں مشترک پہلوؤں کی تلاش کرتا ہے، جیسا کہ مسلمان ہیں۔

مذہبی اقلیتوں کے مقام کو معاشرے کے سیاق وسباق اور خاص طور پر جمہوریت کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کے تناظر میں دیکھنا نہایت اہم ہے۔ جدت اور اس کے ساتھ جمہوریت کا تعین فرد کی آزادی کے ضمن میں کیا جاتا ہے اور علمی شخصیات، مثال کے طور پر ونائق (Vanaik) وغیرہ کا خیال ہے کہ "کسی مذہبی نظام میں بھی فطری طور پر صنفی مساوات یا شہری جمہوریت کی اقدار نہیں پائی جاتیں"۔ جب کہ راجن (Rajan) کا خیال ہے کہ "مذہب اور جمہوریت صرف اتنے عرصہ کے لیے آپس میں ہم آہنگ رہتے ہیں جب تک مذہب میں یہ تصور موجود نہ ہو کہ یہ جائز طور پر طاقت رکھنے کا حق دار ہے"۔ دونوں فلسفی اہم نکات بیان کرتے ہیں اور اگر کوئی ان نکات کو ٹیلر (Taylor) کی کلچر کے اندر مذہب کی اہمیت کے بارے میں بحث کو ساتھ ملا کر ملاحظہ کرے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ مذہب ایک ایسا شعبہ ہے جسے معاشرے میں ایک خاص مقام دیا جانا چاہیے مگر یہ صرف ایک مقام ہی ہو نہ کہ یہ معاشرے کے تمام ثقافتی نظام کی جگہ لینے کے لیے تیار ہو جائے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے جدید جمہوری معاشروں میں عوامی زندگی میں مذہب موجود ہے یا وہ سیکولر ہیں؟ اگر مذہب ہمارے جدید معاشروں کا حصہ ہے تو ایک مذہبی اقلیت کے کلچر کو ضم کیے جانے کے بارے میں کیا رویہ ہونا چاہیے؟ ٹیلر (Taylor) کی طرح مرفی (Murphy) کا دعویٰ ہے کہ "مذہب کلچر کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ میڈیا کی طرف سے دیا جانے والا تاثر یہ ہے کہ کثرت پر مبنی کوئی معاشرہ تعریف کی رو سے ایک سیکولر معاشرہ ہوتا ہے، کیونکہ کسی مذہب کے مخصوص مزاج کی، کسی بھی طرح، اصول قانون میں عکاسی کرنا غلط ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاص قانون کسی ایک گروہ کے مخصوص مزاج کی عکاسی کرے تو وہ فی نفسہ دوسروں کے حقوق کی خلاف ورزی پر منتج ہوتا ہے جبکہ قانون اس مخصوص مزاج کے علاوہ کسی اور چیز کی عکاسی نہیں کرتا"۔

لہٰذا کلچر اور مذہب ایک دوسرے پر انحصار کرنے اور ایک دوسرے میں پیوست ہونے کی وجہ سے باہم پیچیدہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ پوپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان پال کے مطابق ''ایک ایسا مذہب جو کلچر نہیں بنتا دراصل ایک ایسا مذہب ہوتا ہے جسے مکمل طور پر قبول نہیں کیا گیا ہوتا''۔ مذہب کی اہمیت اور مقام کے بارے میں یہ بحث شروع زمانہ کے فلسفیوں ویکو (Vico)اور مونٹیسکیو (Montesquieu) سے شروع ہوتی ہے جن کا خیال تھا کہ ایک متحرک معاشرے کے قیام کے لیے مذہب ضروری ہوتا ہے۔ ویکو(Vico) کا خیال تھا کہ عقل اور مذہب کی مطابقت اعلیٰ درجے کی انسانی ترقی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک اکیلا وجود قائم نہیں رکھ سکتا کیونکہ انسان ہوائے نفس سے تحریک حاصل کرتے ہیں

مسلم معاشرہ اور مقابلہ حسن......امتزاج کی تلاش

اور شاذ و نادر ہی کوئی دو انسان آپس میں متفق ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہب اکیلا توہمات اور کٹر عقائد پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا عقل اور مذہب دونوں کا سہارا لیا جانا چاہیے۔

تاہم، دونوں علمی شخصیات کا یہ بھی خیال ہے کہ جب معاشرے ایک ''اعلیٰ مرحلے'' یعنی ''روشن خیالی'' کے فکر تک پہنچیں گے تو وہ زیادہ سے زیادہ مشابہ ہو جائیں گے، لہذا اس وقت مذہبی خیالات یا ثقافتی اعتقادات پر منحصر تنوع سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں جدید دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود اقلیتی مذہبی گروہوں کی حیثیت کے تناظر میں معاشرے میں مذہب کا کردار بہت اہم ہے۔

راجن (Rajan) کے نظریہ میں مذہب کو بہت اہمیت دی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہمعصر دنیا میں مذہب بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ریاستوں کو انتہائی مذہبی گروہوں کی سرگرمیوں اور اعتقادات سے زیادہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم مذہب کے مقام کے بارے میں بنیادی نظریات میں سے لبرل نظریہ پر توجہ مرکوز کی گئی تھی جس کے مطابق بنیادی طور پر شہری ایسے افراد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کو مختلف حقوق حاصل ہوتے ہیں، جن میں سے ایک مذہبی حق بھی ہے۔ اس نظریہ کے علمبردار رالز (Rawls) کے مطابق معاشرے کے ارکان کو اپنی مرضی کے کسی گروہ کے ساتھ وابستگی کا حق حاصل ہونا چاہیے اور ضمیر کی آزادی بھی دی جانی چاہیے خواہ یہ مذہبی یا غیر مذہبی اظہار کی شکل میں ہو۔ لہذا ریاست اپنے لوگوں پر انحصار کر کے ایک مساوی اور برداشت کرنے والا معاشرہ تخلیق کرتی ہے، جب کہ یہ مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی حکمت عملی اپناتی ہے۔ لوگوں کو مذہبی گروہوں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ریاست کے کم سے کم کردار کے ساتھ ایک ایسی جگہ درکار ہوتی ہے جس کی طرف وہ رجوع کر سکیں۔

حد سے بڑھی ہوئی مذہبی آزادی کی ایک مثال جس کے منفی نتائج برآمد ہوئے، ہالینڈ کی ہے جہاں حالیہ واقعات (تھیو وان گاف کا قتل اور ملزم کے مقدمہ کی سماعت) کسی مذہبی اقلیت کے نہایت کٹر دینی خیالات اور ریاست کی لبرل آراء کے درمیان براہ راست تصادم کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان واقعات سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تارکین وطن کو مغربی یورپی ممالک کے لبرل نظریات کی پابندی کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر تارکین وطن اپنے طریقے کے مطابق انتہا پسندانہ مذہبی نظریات کے حامی ہوں گے تو وہ لبرل معاشروں کی ساخت کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہالینڈ اور برطانیہ کی مثالیں ہمیں راجن (Rajan) کی تجویز کی طرف واپس لے جاتی ہیں کہ جمہوریت اور مذہب ہم آہنگ ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ مذہب غالب نہ ہو اور کوشش کی جائے کہ اقلیت کے مطالبات اور کل کے حقوق کے درمیان ایک توازن برقرار رکھا جائے۔

مسلمان بطور اقلیت

یورپ کے حوالے سے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں کیا چیز متحد کرتی ہے اور بطور ایک گروہ ان کی شناخت قائم کرتی ہے اور دیگر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حوالے سے وہ کیسے اپنے آپ کو متعین کرتے ہیں۔ رمضان واضح کرتے ہیں کہ ''اسلامی مذہبیت'' نام کی کوئی چیز موجود نہیں جب کہ عیسائیت میں موجود ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ خدا اور فرد کے درمیان ایک تعلق ہے۔ ایک ایسا تعلق جو اس نظریے کو راہ دیتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی نظر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمان ہر ایسے انسان میں ایک فطری اور لازمی چیز ہے جو بنیادی طور پر خدا سے واسطہ رکھتا ہو۔

لہذا ایک مسلمان کی لازمی شناخت اس کا مذہب ہوتا ہے کیونکہ انجام کار کوئی بھی اور چیز قدر و اہمیت نہیں رکھتی'' ان کی قومی ثقافتوں (مسلم) کے تنوع کے باوجود ان کے ایمان کی روح، ان کی شناخت، ان کی دنیا میں موجودگی کے تصورات ایک ہیں، وہ اپنے اس احساس تعلق کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ مشترک ایمان رکھنے والے ایک ہی گروہ سے رشتہ رکھتے ہیں اور حوالے کے یہ نکات انہیں اسی طرح زیادہ گہرے انداز میں اسلام کی وسیع حدود سے وابستہ کرتے ہیں۔''

پھر یہ کہ مسلمان اپنے ساتھی مسلمانوں کی طرف رجوع کریں گے اور دیگر شناختوں کے مقابلے میں اپنی شناخت امہ یا اسلامی خاندان سے قائم کریں گے، لہذا جب وہ دارالحرب، میں بھی رہ رہے ہوں تو مسلمان ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو تمام سرحدوں سے بالاتر ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے مذہب کے ساتھ تعلق میں رہتے ہیں۔ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس کے مطابق ایک مسلمان اپنے بھائی کی وجہ سے مضبوط ہوتا ہے اور یہ کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، اگر ایک حصہ کسی بیماری سے متاثر ہوتا ہے، تو باقی جسم بھی اس تکلیف کی وجہ سے بے خوابی اور بخار کی نذر ہو جاتا ہے۔

دور حاضر کے سکالر تاریخی اصطلاحات دار الاسلام اور دارالحرب کے بارے میں بھی بات کرتے ہیں اور بحث کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو کسی ملک میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے تو اس ملک کو دارالحرب نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر مسلمان صحیح انداز سے اسلام پر عمل کریں تو یہ تصور ہر زمان و مکان میں تصور'' العالمیہ الاسلام، یا انسانی تعلیمات کی عالمگیری جہت کے حوالے سے درست ہے۔ شریعہ ہر اس چیز کے انضمام کو تحسین کو نظر سے دیکھتی ہے جو تسلیم شدہ اصول کے خلاف نہ ہو لہذا ان میں سے ایک سکالر طارق رمضان کے خیال میں (شریعہ کے بعض پہلوؤں کی) نئے حالات کے مطابق تشریح کی جا سکتی ہے۔

رمضان کی طرح کے سکالروں اور ماہرین دینیات کی تصانیف سے واضح ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ پایا جاتا ہے جو کہ قومیت یا نسل سے استوار نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی وجہ سے راسخ ہوتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مسلم اقلیتی کلچر آرش معاشرے میں ضم کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ انہیں اپنے طرز معاشرت پر چھوڑ دیا جائے کہ جب تک وہ چاہیں اپنے عقائد پر عمل کرتے رہیں۔

غیر مسلم سرزمین پر رہنے والے مسلمان کے فرائض

مسلمان اقلیتی گروپوں کی موجودہ حالت پر غور کرنے سے قبل غیر مسلموں کی سرزمین پر مسلمانوں کا اقلیتوں کی حیثیت سے قیام کا قرآن پاک اور قدیم فقہاء کی آراء کے مطابق جائزہ لینا اہم ہے۔ جس طرح سکالر ڈوئی (Doi) نے وضاحت کی ہے کہ یہ ایسی صورتحال ہے جس کے متعلق پہلے قیاس نہیں کیا گیا۔ ایک وقت تھا جب کسی نے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ ایک ایسا وقت آ جائے گا کہ جب مسلم ریاستیں زوال پذیر ہوں گی اور چند ایسے علاقے جن پر کبھی مسلمانوں کی حکومت ہوا کرتی تھی وہ غیر مسلموں کے اختیار میں چلے جائیں گے اور یہ کہ مسلمانوں کو اقلیتوں کے طور پر غیر

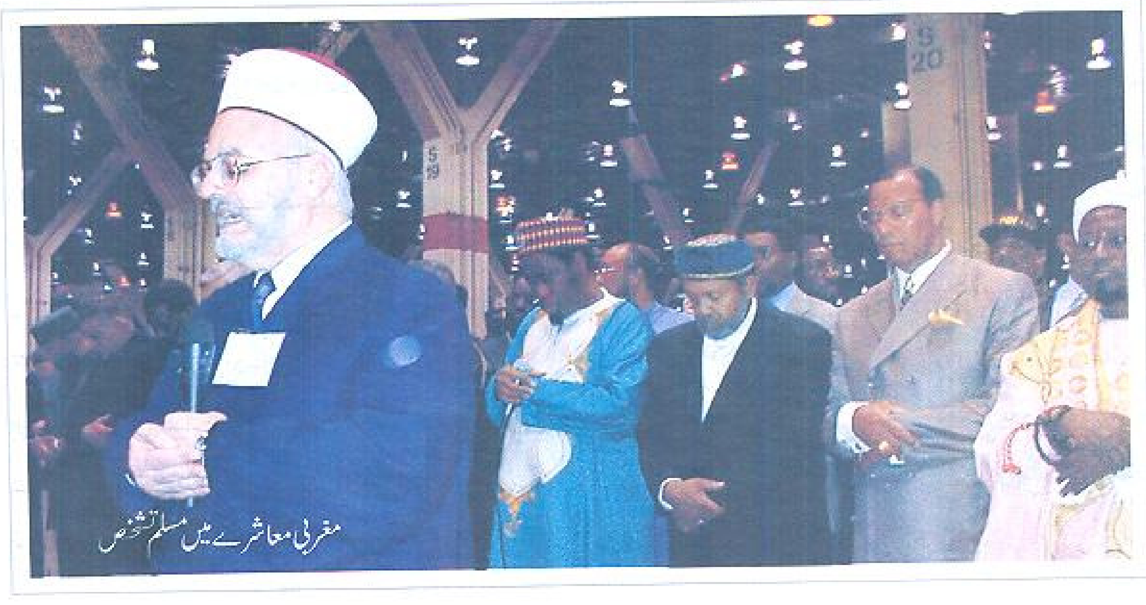

مغربی معاشرے میں مسلم تشخص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلموں کے اقتدار کے تحت رہنا پڑے گا۔

اسلامی ممالک اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان فرق کرنے کے لیے استعمال کی گئی اصطلاحات غیر مسلم خطوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے معلومات یا ہدایات کے فقدان کو اجاگر کرتی ہیں۔ اسلامی سلطنت کے آغاز کے دور میں مسلم دنیا سے باہر کا کوئی بھی علاقہ دارالحرب کہلاتا تھا اور اسلامی سلطنت کے اختیار کا علاقہ دارالاسلام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اسلامی سلطنت کے عروج کے دور میں اس کی سرحدوں کے اندر بڑی تعداد میں غیر مسلم یا ذمی رہائش پذیر تھے جو اسلام قبول کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ اسلام کی ہدایات کے تحت یہ لوگ اپنے مذہب پر عمل کرنے کے لیے اس وقت تک آزاد تھے جب تک مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کے راستے میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ ''جزیہ'' ایک قسم کا ٹیکس تھا جو غیر مسلم شہری مسلم ریاست کو ادا کرتے تھے جس کے بدلے میں انہیں

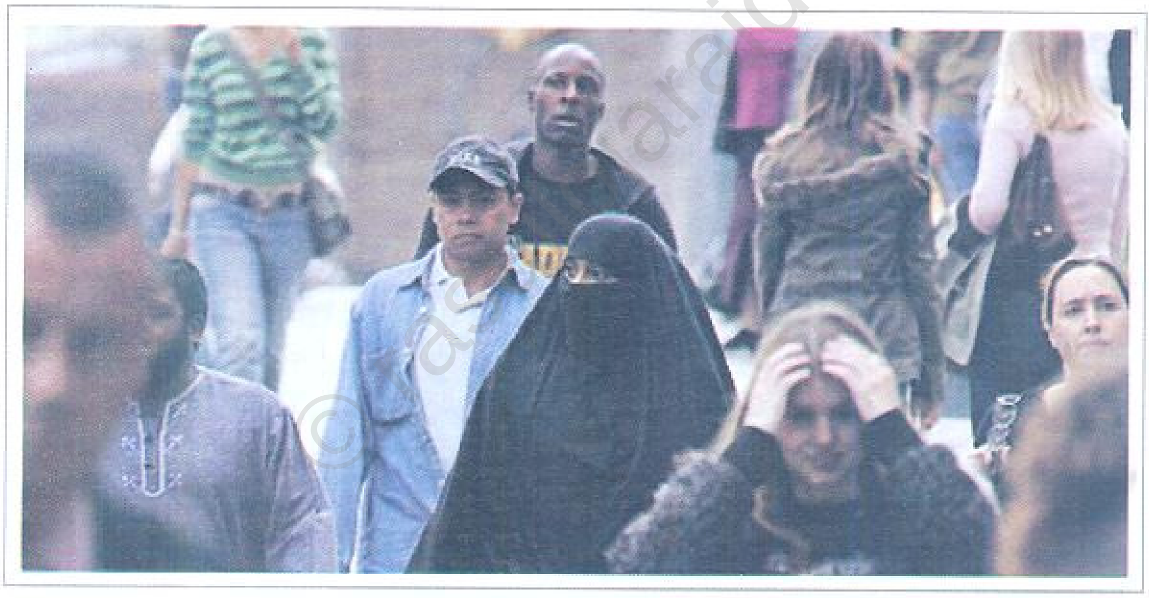

حفاظت فراہم کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک نظام تشکیل دیا گیا تھا جو صدیوں تک جزیرہ عرب اور مشرقی یورپ میں رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے کامیابی سے چلتا رہا۔ مسلمانوں کی سرزمین پر غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی کو باضابطہ بنانے کے قواعد واضح تھے جب کہ غیر مسلم خطوں میں مسلمانوں کے رہنے کے لیے ہدایات کا وجود نہیں تھا کیونکہ یہ صورتحال پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

غیر مسلم خطوں میں سفر کرنے والے یا ان کے اندر کچھ عرصہ گزارنے والے مسلمانوں کے بارے میں یہ تصور تھا کہ وہ شریعہ پر کاربند ہوں گے اور خدا کے مطیع رہیں گے۔ خدوری، جو کہ اسی مکتب فکر کے ماننے والے تھے جو ابن تیمیہ اور مولانا مودودی کا تھا، وضاحت کرتے ہیں کہ غیر مسلم خطوں میں رہنے والے مسلمانوں کو عارضی صورتحال میں مبتلا تصور کرنا چاہیے اور اس کے باوجود بھی وہ قانون شریعہ کے پابند ہیں۔ شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''کفار کی سرزمین پر رہنے والے کسی بھی مسلمان کو اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنی چاہیے۔ وہ وہاں صرف اس صورت میں ہی رہ سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دیے ہوئے مذہبی اصولوں کے مطابق رہتا ہو، یا وہ بیماری، کمزوری یا مجبوری کی وجہ سے ہجرت کرنے کے قابل نہ ہو۔''

محمد رضا ایسے سفر کو 'ہجرت' کی ایک قسم قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو غیر مسلم سرزمین پر موجودگی کے جواز کے طور پر اسے اسلام کی طرف سے عائد فرض اور لوگوں کو اسلام کے بارے میں آگاہی دینے کا ایک طریقہ خیال کرتے ہیں۔ جب کہ ابن تیمیہ، ماوردی اور الصادق کہتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ رہ کر اسلام کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ شرط تو صرف اس وقت پوری ہوتی ہے جب لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جا رہا ہو، نہ کہ اس صورت حال کے لیے ہے کہ جہاں مسلمان غیر مسلم معاشرے میں ''وہاں کے فطری رنگ'' میں ڈھل جائیں۔ ابوصالح تشریح کرتے ہیں کہ ''قدیم فقہاء ایسے مسلمان کو نفرت سے دیکھتے ہیں جو دارالاسلام سے دارالحرب کی طرف ہجرت کرے''۔ غیر مسلم خطوں میں رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں پیش کی گئیں آراء وہاں عارضی رہائش کے بارے میں ہیں اور یہ آج کے مسلمانوں کو درپیش صورتحال کے بارے میں نہیں ہیں جبکہ آج مسلمان، غیر مسلم ممالک میں مستقل رہائش رکھتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجودہ مسلمان اقلیتیں

آج دورِ جدید کی علمی شخصیتوں اور ماہرین دینیات نے ان قدیم ہدایات کو بدلتی ہوئی دنیا کے تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ چند ایک کا خیال ہے کہ اسلامی احکام کی بدلتے ہوئے دور کے مطابق تشریح کی جائے جب کہ چند دوسرے لوگ قدیم فقہاء کے اعتقادات اور اقدار پر مصر ہیں۔

تعریف خالدی تین فرسودہ خیالات کی شناخت کرتے ہیں جو اس فہم کے لیے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں کہ جدید یورپ میں مختلف گروہوں کے انضمام کا مقصد کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انضمام کا عمل شروع کرنے سے قبل مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ان فرسودہ خیالات کو ضرور سمجھنا چاہیے۔

ان میں سے پہلا اس امر کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ اسلام میں کوئی ''چرچ'' یا جیسا اس نے اس اصطلاح کی تعریف کی ہے، جائے عبادت موجود نہیں۔ عبادت کی جگہ کسی مذہب اور اس کے ماننے والوں کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ جگہ مسجد ہوتی ہے، ایک ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہوتے اور خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعلق کے احساس کو فروغ دیتے ہیں۔ مسجد کی اس حیثیت کی شناخت مسلمانوں کو رجوع کرنے کا مقام فراہم کرتی ہے اور غیر مسلموں کو ایک مرکز جہاں وہ اپنے سوالات یا تشویش پیش کر سکیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ فرسودہ خیال جدید یورپ میں زائد از ضرورت خیال کیا جائے کیونکہ مسجدیں مسلمانوں اور اسلام کے پیغام کے لیے مرکزی مقام بن چکی ہیں اور مسجدوں کی حیثیت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نزدیک مسلمانوں کے روحانی اور سماجی مرکز کی ہے۔

خالدی کے نزدیک دوسرا فرسودہ خیال اس تصور کے ساتھ منسلک ہے کہ اسلام ایک مذہب اور طرزِ زندگی ہے، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان جب کسی نئی ریاست میں رہائش اختیار کریں گے تو اپنی طرزِ زندگی کے چند پہلوؤں میں تبدیلیاں لانے کے لیے رضامند نہیں ہوں گے یا ان میں ایسی صلاحیت نہیں ہوگی۔ اکثریتی کلچر اس کے ردِعمل میں نئے مسلمان باسیوں کا اس سوچ کی وجہ سے مخالف ہو سکتا ہے کہ اقلیتی کلچر اکثریت کے طرزِ زندگی کے ساتھ مناسبت اختیار رکھنے کے قابل نہیں۔ خالدی مدلل انداز میں کہتے ہیں کہ ہر مذہب درحقیقت ایک طرزِ زندگی ہوتا ہے اور اسے معاشرے کے دیگر پہلوؤں سے الگ کرنا اور سمجھنا ناانصافی کے مترادف ہے۔ ''تمام مذاہب کسی نہ کسی وقت یہ حکم ضرور دیتے ہیں کہ انسان کس چیز کی اور کیسے پرستش کریں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ کیا رویہ اختیار کریں اور اپنے آپ کو منظم کر کے ایک برادری تشکیل دیں اور اچھے اوصاف اپنائیں وغیرہ وغیرہ۔''

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مذہب افراد یا ریاستوں کی طرف سے کیے گئے فیصلوں اور سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تاہم مختلف مذاہب میں شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ افراد سوچ کے ان مختلف پہلوؤں کو تسلیم کریں جن کے مطابق مختلف لوگ اپنی زندگیاں گزارتے ہیں، اس طرح وہ کوئی سیکولر معاشرہ تشکیل نہیں دیتے بلکہ ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جو تمام مذاہب کو سموئے ہوئے ہو۔

تیسرا فرسودہ خیال مذکورہ بالا سے قریبی رشتہ رکھتا ہے مگر بلاواسطہ ریاست کے کردار سے تعلق رکھتا ہے۔ دیگر سکالروں کے ساتھ خالدی کہتے ہیں کہ اسلام خالص عقلی بنیادوں پر استوار نہیں اس کی وجہ سے ایک مستقل جاری عمل کی بھی نفی ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ایسا پہلو ہے جو ہر مذہب کے بارے میں درست ہے۔ ایک زمان و مکان کا اسلام دوسرے زمان و مکان کے اسلام سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ ابتدائی اسلامی سلطنت میں، الفارابی کے مطابق، خلیفہ کے روحانی کردار اور قانونی کردار میں ایک واضح فرق موجود تھا۔ خالدی کا خیال ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی سکالر نظریات کی نئی تشریح اور سماج کی از سرِ نو اتحاد سازی کریں۔ مذہبی رسومات سے متعلق اسلامی اصولوں اور سیکولر معاملات اور معاشرے سے متعلق اصولوں کے درمیان امتیاز قائم کرنا بھی بہت اہم بات ہے: پہلی قسم کے اصول تفصیلی اور جامع ہیں جبکہ دوسری قسم کے اصول ایک مقررہ ڈھانچے کی بجائے عمومی ہدایت مہیا کرتے ہیں۔ طارق رمضان کہتے ہیں کہ ''مسلمانوں کو انفرادی طور پر اور آزادی کے ساتھ اپنی عقل، آزادی اور تخیل کا استعمال کر کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ سماجی اور سیاسی طور پر ان کی ذمہ داری کیا بنتی ہے۔''

> ایک عالمگیر سروے کے مطابق یورپ کے لوگوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ جو مسلمان ان کے ملکوں میں آئے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اپنے نئے ملک کے رواجوں کو اپنائیں، وسیع تر معاشرے سے نمایاں طور پر الگ نظر آنا چاہتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رمضان اور پاریکھ (Parekh) محسوس کرتے ہیں کہ گروہ جب کسی نئے ملک میں رہائش اختیار کرتے ہیں تو فطری طور پر پہلے عشروں میں اپنی ''حفاظت'' کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اجنبی لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رابطے کی وجہ سے اپنے کلچر کو پہنچنے والے نقصان کے خلاف حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ کسی اقلیتی کلچر/گروہ کو معاشرے میں ضم کرنے کی کوشش کرتے وقت اس مظہر کو ''فطری'' سمجھ کو قبول کیا جانا چاہیے۔ یہ وہ انداز ہے جس کی روشنی میں تمام تارکین وطن آبادیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے ابتدائی اقدامات کو سمجھا جانا چاہیے۔ اس ''حفاظتی'' مرحلہ کے بعد، رمضان اصرار کرتے ہیں کہ اسلامی ماہرین دینیات کو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح مسلمان، معاشرے کے بڑے دھارے کا حصہ بننا شروع کریں جب کہ وہ اپنی ثقافتوں یا مذاہب کے ان پہلوؤں کو برقرار رکھ سکیں جنہیں وہ اپنی طرز زندگی کے لیے بنیادی تصور کرتے ہیں۔ یہ حفاظتی مرحلہ، جو رمضان کے کہنے کے مطابق وقت اور سیاق وسباق کے حوالے سے تبدیل ہوتا ہے، اسے مثبت یا منفی نہیں سمجھا جانا چاہیے بلکہ انضمام کے اس عمل کا ایک عام حصہ خیال کیا جائے اور مسلمانوں کو مدد اور راہنمائی مہیا کی جانی چاہیے تا کہ ان کے لیے انضمام کے شرکتی مراحل کی طرف حرکت کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ ''مغربی مسلمانوں کے پاس، اس لیے کہ وہ نئے معاشروں میں مستحکم ہونے کے تجربہ سے گزر رہے ہیں، کوئی اور چارہ کار نہیں کہ وہ بنیاد کی طرف واپس جائیں اور اپنے حوالہ جاتی نکات کا مطالعہ کریں تا کہ وہ خاکہ بنا سکیں اور فرق کر سکیں کہ ان کے مذہب میں کیا چیز ایسی ہے جو تبدیل نہیں ہو سکتی یا ثابت شدہ ہے اور کونسی چیز تبدیل کی جا سکتی ہے یا متغیر کی حیثیت رکھتی ہے''۔

رمضان وضاحت کرتے ہیں کہ اس طریقہ کار میں اسلام کے تین اجزاء کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے۔ یہ اجزاء المصالح یا عام بھلائی، اجتہاد یا مسلمانوں کی طرف سے قانون شریعہ کے مطابق زندگیاں گزارنے کی کوشش اور فتویٰ یعنی غیر مسلم اکثریتی ثقافتوں میں انضمام کے بارے میں قانونی فیصلہ شامل ہیں۔ صدیوں سے ان تین اجزاء کے بارے میں سکالروں کی مختلف آراء رہی ہیں۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ مختلف ذرائع، مقامات اور زمانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا نظام بنایا گیا ہے کہ جس کا حوالہ تمام دنیا کے مسلمان (علماء) دیتے ہیں اور اس کا حوالہ آج مسلمان پیش کرتے ہیں۔ رمضان کہتے ہیں کہ ہم آج کے معاشروں کی مناسبت سے اس نظام کو مزید فروغ کیوں نہیں دے سکتے۔ اگر موجودہ نظام کا جائزہ لیا جائے اور اچھی طرح غور کیا جائے اور فرق قائم کیا جائے کہ کیا چیز قانون ہے اور کیا چیز ثقافتی طور پر سامنے آئی ہے تو اس کے نتیجے میں ایک مسلمان مغرب میں امن کے ساتھ قیام کر سکتا ہے۔ اس بنیادی نظام کے علاوہ رمضان ایک استثنا بر بنائے ضمیر، کی بھی ضرورت واہمیت کی تاکید کرتے ہیں جس کی بناء پر مسلمان اظہار کر سکیں کہ بعض سرگرمیاں یا رویے ان کے مذہب کے خلاف ہیں۔ میرے خیال میں یہ چیز مغربی معاشروں میں بہت اہم ہے کیونکہ اس سے مذہبی شفافیت کا احساس فروغ پائے گا، غلط فہمی دور ہوگی اور اس طرح نفرت اور عداوت کا خاتمہ ہوگا۔

خالد لطیف، مسلمان مذہبی رہنما ہونے کے علاوہ نیویارک سٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں

شیخ عبداللہ بن بیہ جو مسلمانوں کی اقلیتی حیثیت کے بارے میں کافی زیادہ تحریریں مرتب کرتے ہیں، مسلمانوں کے لیے اس ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی ''نئی'' قومیت اور رہائش والے ملک کو قبول کریں تا کہ وہ معاشرے کے بڑے دھارے سے علیحدہ ہونے کے احساس سے بچ سکیں۔ ''اس سرزمین کے قوانین کا احترام نہایت ضروری ہوتا ہے جس میں آپ نے رہائش اختیار کر رکھی ہو''۔ وہ اس تقاضے پر زور دیتے ہیں کہ شریعہ کی حکومتی پہلوؤں کا اطلاق اس بنا پر اقلیت ہونے کی صورتحال میں نہیں ہوتا کیونکہ مغربی معاشروں کو دارالحرب تصور نہیں کیا جا سکتا اگر وہ اقلیتوں کو اپنے مذاہب پر آزادی سے اور تنگ کیے بغیر عمل کرنے کی اجازت دیں۔ اس کی بجائے انہیں ایسے علاقے تصور کیا جاتا ہے جو معاہدہ کے تحت آتے ہیں۔ ماہرین دینیات مثلاً ملک (Malik) مزید آگے بڑھتے ہیں اور کہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ انہیں اسلام کے ممالک یا دارالاسلام سمجھا جانا چاہیے کیونکہ وہ مذہب پر عمل کرنے اور اظہار کی آزادی بخشتے ہیں۔ رمضان وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''اسلامی قانون اور فقہ مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی رہائش کے ملک میں مثبت قانون کے اس منبع کو تسلیم کریں جس کا نفاذ اس متضمن اخلاقی معاہدے کی صورت میں ہوا جو ان کی وہاں موجودگی کی حمایت کرتا ہے''

اس کی وجہ سے ایک بار پھر کسی ملک کے اندر یا کسی گروہ کے ساتھ شناخت کا تصور ابھرتا ہے۔ کیا مغرب میں مسلمان اپنے آپ کو سب سے پہلے مسلمان خیال کرتے ہیں اور پھر وہاں کے شہری تصور کرتے ہیں یا برعکس؟ رمضان اور خالدی، مذہب اور طرز زندگی کے بارے میں دوسرے فرسودہ خیال کی طرف واپس جانے پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ ایک غلط سوال ہے۔ رمضان مدلل انداز سے کہتے ہیں کہ قومیت اور مذہب ایک ہی نظام کے اجزا نہیں ہیں جب کہ خالدی کہتے ہیں کہ تمام مذاہب طرز زندگی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کسی کے لیے شناخت کی مختلف ''پرتوں'' کو الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ رمضان قومیت یا کسی مقام پر لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کے انداز کو محض شناخت کا جز و سمجھتے ہیں اسی اثناء میں عقیدہ، زندگی اور بذات خود موجودات کو نئے معاشروں کے مطابق ''موافقیت پیدا کرنے'' کی ضرورت کو جواز بخشتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا یہ متفقہ خیال کہ عقیدہ ان کی شناخت کی روح ہے، یہ پہلو انہیں بہت سے دیگر گروہوں سے الگ کر دیتا ہے جو مذہب کو محض اپنی شناخت کی بہت سی پرتوں میں سے محض ایک پرت خیال کرتے ہیں۔

رمضان ایسے سوال اٹھاتے ہیں جن سے اس وضاحت میں مدد ملتی ہے کہ مسلمانوں کی زندگیوں میں مذہب کو اتنا مرکزی کردار کیوں حاصل ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ مسلم شناخت کے لوازم جن کا انحصار مذہبی اصولوں پر ہے انہیں ثقافتی عوامل سے الگ کیا جانا چاہیے اور مختلف معاشروں کے حساب سے ثقافتی پہلوؤں کو وہاں رہنے کے لیے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی مسلمان اقلیتیں اپنے متعلق یکسو نہیں ہیں وہ اپنے آپ کو ایسے دائمی غیر ملکی تصور کرتے ہیں جو معاشرے کے خاص دھارے سے باہر اس کے متوازی یا اس معاشرے سے الگ تھلگ زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں، جیسا کہ اس کی مثالیں موجودہ مغربی یورپی سیاق وسباق میں ملتی ہیں۔ رمضان کا خیال ہے کہ اسلامی ماہرین دینیات کے لیے ضروری ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ مسلمان ہونے سے کیا مراد ہے اور وہ عالمگیر اصول وضع کریں جن پر مغرب میں بسنے والے مسلمان عمل کریں، اگر انہیں وہاں وفاداری کے ساتھ رہنا ہے۔ رمضان کے مطابق اگر ایسا ہو جائے تو ایک اچھا آرش مسلمان یا ایک اچھا ڈچ مسلمان بننا ممکن ہے۔

۱۹۹۰ء کے عشرہ کے دوران اقلیتوں کے طور پر رہنے والے مسلمانوں کے سنجیدہ مسائل کے حل کے لیے کئی اجلاس منعقد ہوئے مگر ماہرین تعلیم مثلاً شیخ بن بیہ اور رمضان نے جن مسائل کی نشاندہی کی ان کا حل پیش نہیں کیا گیا۔ درحقیقت انضمام کے موضوع پر بہت سا غور و فکر مغرب میں سکالروں نے کیا ہے جس میں نئے اجتہاد یا شریعہ کے قوانین کے مطابق رہنے کے بارے میں موضوعات شامل ہیں، یہ سارا غور و فکر محل نظر ہے۔ رمضان اس ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ دو علیحدہ گروہ/کائناتیں تخلیق کرنے سے گریز کیا جائے جن کی سرحدیں آپس میں نہ ملتی ہوں اور صرف ان محدود شعبوں میں ہی سمجھوتا کریں جہاں ان کا نقطہ اتصال ہو۔

> اکثریتی اور مسلمان گروہوں کو مل کر غلط تصورات کا خاتمہ کرتے ہوئے مل جل کر کام کرنے کا آغاز کرنا چاہیے۔ لوگوں کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں بلکہ انہیں تعصب سے پاک ہو کر ایک ساتھ رہنے کا چلن اختیار کرنا ہوگا

اس ضمن میں صرف ایک معمولی کوشش کی گئی ہے اور زیادہ گہری تحقیق کی ضرورت ہے خاص طور پر اس ضمن میں کہ مسلمان مطلوبہ عالمگیر اصولوں کے نفاذ کے سلسلے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ الگ کائناتوں کے وجود کی وضاحت کے لیے محمد رضا اپنی توجہ برطانیہ میں موجود مسلمان گروہوں کے معاشرے میں الگ تھلگ وجود کی طرف مرکوز کرتے ہیں۔ وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ: ''سکالروں کو اس سیاق وسباق کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں جس کے مطابق مسلمان وہاں رہائش پذیر ہیں لہذا وہ ان گروہوں کو درپیش مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں کر سکتے۔ جو حل وہ پیش کرتے ہیں وہ فراریت یا تاریک خیالی پر مبنی ہے۔''

انضمام کے سلسلے میں گزشتہ کوششیں ایسی تھیں کہ انہیں ''علامتی افعال'' کہا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر یہ کہ مسلمان انتخابات میں ووٹ دیتے ہیں مگر ان میں شمولیت کا شعور موجود نہیں یا یہ کہ ان مسلمانوں کی ان معاشروں

© rasailojaraid.com

میں آ واز سنی جائے۔ میں ان تمام کوششوں کو برداشت کیے جانے سے تعبیر کروں گی نہ کہ معاشرے میں ضم ہونے سے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سطحی یا ادارتی سطح پر یہ ضم ہونے کا عمل دکھائی دیتا ہے مگر مقامی اور کلچرل سطحوں پر اگر شناخت کے مبادی اور تعلق قائم کرنے کے پہلوؤں سے دیکھا جائے تو مسلمان گروہ ایک بالکل جدا اور الگ وجود کی صورت میں موجود رہے۔ آئر لینڈ میں رہنے والے مسلمان گروہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی صورتحال سے دوچار ہے۔

یورپ میں مسلمان گروہ

اکبر ایس احمد کسی مسلمان کے لیے مذہب کی اہمیت کے بارے میں کہتے ہیں: ''مسلمان اپنی مسجدوں میں جانا اور اپنی نمازیں امن کے ساتھ بغیر مداخلت ادا کرنا پسند کرتے ہیں، بغیر مار کھائے، تفتیش کے لیے اٹھائے جانے کے بغیر، وہ اپنے گھروں میں خلوت کو پسند کرتے ہیں جہاں وہ اپنی زندگیاں بطور مسلمان بسر کر سکیں۔''

مذکورہ بالا خیالات سے تنہائی کا تصور سامنے آتا ہے اور اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان صرف تنہا رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ضم ہونے کا عمل نہیں ہے مگر یہ وہ چیز ہے جو بہت سے یورپی ممالک میں ہوتی نظر آ رہی ہے۔

ہالینڈ میں واقع پیو (Pew) ریسرچ سنٹر کی طرف سے جاری کیے گئے ایک عالمگیر سروے کے مطابق یورپ کے لوگوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ جو مسلمان ان کے ملکوں میں آئے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اپنے نئے ملک کے رواجوں کو اپنائیں، وسیع تر معاشرے سے نمایاں طور پر الگ نظر آنا چاہتے ہیں۔ اس صورتحال کا تمام تر الزام، صرف مسلمانوں پر یا صرف اکثریتی کلچر پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی بجائے زیادہ الزام حکومت کی امیگریشن پالیسیوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ یورپ کی بہت سی حکومتوں کا رویہ ''جدا مگر یکساں'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ تنہائی یورپی معاشروں میں موجود اس خیال کی وجہ سے برقرار ہے کہ ٹکراؤ کو کھلے عام زیر بحث لانے پر پابندی ہے جو کہ ایسا رویہ ہے جسے ایک علمی شخصیت ماسکی (Masci) نے ''عدم مداخلت کی سوچ'' سے تعبیر کیا ہے۔ ایک ایسا رویہ جس میں مسلمان اقلیتوں کو ایک عارضی مظہر سمجھا جاتا ہے جو بالآخر وہاں سے چلے جائیں گے لہذا انہیں بڑے آرام سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

آج فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے اور حالیہ دور میں اس کی وجہ سے خاص طور پر ہالینڈ، فرانس اور ڈنمارک میں شدید مسائل پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ ایک تبصرہ نگار باور (Bower) وضاحت کرتے ہیں: ''ہالینڈ میں معاشرے کے بڑے دھارے اور مسلمانوں کی ضمنی ثقافت کے درمیان فاصلہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جب کہ حالیہ عشروں تک ہالینڈ کی کم، نسلی طور پر یکساں مقامی آبادی کو یورپ کے باہر سے اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی ہجرت کا بالکل تجربہ نہیں تھا۔''

> کفار کی سرزمین پر رہنے والے کسی بھی مسلمان کو اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنی چاہیے۔ وہ وہاں صرف اس صورت میں ہی رہ سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دیے ہوئے مذہبی اصولوں کے مطابق رہتا ہو، یا وہ بیماری، کمزوری یا مجبوری کی وجہ سے ہجرت کرنے کے قابل نہ ہو۔

یہ رویہ یورپی معاشروں میں وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے اور حکومتوں کے عدم مداخلت کے رویے کے ذریعے برقرار رکھا گیا ہے۔ باور (Bower) کہتے ہیں کہ یورپی معاشرے ''غیر گورے لوگوں'' کو اپنے معاشرے کے شہریوں کے طور پر قبول نہیں کرتے اور ان کو شہریوں کے طور پر قبول کرنا فطری عمل نہیں ہوگا''۔ اس کا حل کیا ہوگا یا کیا کوئی حل موجود ہے؟ یورپی ممالک میں مسلم اقلیت کو ضم کرنے کے عمل میں مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انہیں ایک سماجی گروہ کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ میں نے پہلے ہی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مسلمان اپنی زندگیاں اپنی گروہ کے گرد ہی گزاریں گے کیونکہ ان کے طور طریقے کا یہ ایک بنیادی حصہ ہے۔ بوڈی (Bodi) اس ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک گروہ سمجھا جانا چاہیے نہ کہ بطور افراد کا مجموعہ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حوالے برطانیہ کے لیے خاص طور پر درست ہیں۔ ایک اور بنیادی کوشش جو تمام یورپی حکومتوں کو کرنی چاہیے وہ ہے کھلا دل رکھنا اور مکالمہ کرنا۔ آج اقلیتی گروہوں کے مسائل پر گفتگو سے متعلق پابندی کے رویے کو اکثریتی کلچر کی نفسیات سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

کھلی ذہنیت دونوں طرف سے اپنائی جانی چاہیے۔ یہ ذمہ داری مسلمان گروہ اور اس کے رہنماؤں کی بھی ہے کہ وہ زیادہ کھلی ذہنیت رکھیں اور

© rasailojaraid.com

مذاکرات کے لیے رضامند ہوں۔ ایک دانشور آردیری (Quardiri) اس بات کی ضرورت واہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''یورپی مسلمان کی کچھ اور حیثیت ہے۔ وہ ایک شہری ہے لہذا دوسروں کے برابر ہے۔ اسے قوانین کا احترام کرنا چاہیے اور شہریت کے تقاضوں کے مطابق اپنے وطن کی خدمت کرنی چاہیے۔ مگر یہاں پر یہی مسئلہ ہے۔ ایک باایمان مسلم شہری کی نظر میں، شہریت سے بالاتر اس کا مذہب، اس کی شریعت، اس پر عمل، اس کے اصول اور اقدار ہیں۔ لہذا وہ ایک کشمکش میں ہے۔ وہ قوانین جو شہریت پر غالب ہیں ایسی چیز ہیں جو اس کے عقائد میں موجود باتوں سے متصادم ہیں۔ کیا اسلام یورپی شہریت سے عدم مطابقت رکھتا ہے یا صورتحال اس کے برعکس ہے؟ مسلمانوں کے خیال میں رکاوٹ سیکولر قوانین کی وجہ سے سامنے آتی ہے۔ اس صورتحال میں، مسلمان شہریوں کو یا تو مقتدرہ کی طرف سے (اسلام پر عمل کرنے کے سلسلے میں) ایک انکار کا سامنا کرنا چاہیے اور سیکولرازم کے نام پر خدائی احکامات کے سلسلے میں ایک ادنیٰ اور نامکمل اسلام پر عمل کرنا چاہیے یا اس مقتدرہ میں ایک وسیع سیاسی، قانونی اور تمدنی وسعت طلب کرنی چاہیے تا کہ قانون اور لازم اسلامی اقدار پر عمل درآمد ہو سکے۔

حاصل:

یورپ کی موجودہ صورتحال دو باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اسلام کی تشریح وتعبیر کے ضمن میں مسلمانوں کے درمیان ایک سے زیادہ آراء ہیں۔ دوسرا یہ کہ مسلمان یورپی ممالک میں ضم ہونے کے لیے گرم جوش نہیں۔ یورپی معاشرہ اب اپنے آپ کو کئی مسلمان گروہوں کے درمیان پاتا ہے جن کا کوئی مرکزی ادارہ موجود نہیں۔ یہ مسلمان گروہی وابستگی میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی حمایت تلاش کرتے ہیں اور اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ شناخت قائم کرنے کے قابل ہوتے ہیں لہذا وہ بڑے معاشرے کے اندر ضم ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے اندر ان معاشروں میں سماجی طور پر غیر مسلموں کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کی خواہش بھی زیادہ نہیں ہے۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں نے معاشرے اور شناخت کے حوالے سے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں، وہ درست نہیں۔ اسی طرح وہ اس حوالے سے اسلام کی کوئی واضح اور متفقہ تعبیر بھی نہیں رکھتے۔ دوسری طرف یورپی حکومتوں کو چاہیے کہ مسلمانوں کی چند نمایاں ضروریات کی شناخت کریں اور اس بنیاد پر ان سے مذاکرات کریں۔ ان ضروریات کی شناخت کے ذریعے شعور بڑھے گا اور مسلمان گروہوں کے بارے میں پائے جانے والے چند غلط تصورات کا ازالہ ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یورپی حکومتیں اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ مذہب مسلمان گروہوں کے لیے ایک متحرک قوت ہے لہذا اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح مسلم گروہوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ حکومتوں کے ساتھ زیادہ مذاکرات کے لیے راضی ہوں۔ ایسا کر کے مسلمان بھی اس یورپی ملک کے اکثریتی کلچر کے بارے میں اپنے غلط تصورات کی درستگی کرنے کے قابل ہوں گے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔

ابتدائی سطح پر، اکثریتی اور مسلمان گروہوں کو مل کر غلط تصورات کا خاتمہ کرتے ہوئے مل جل کر کام کرنے کا آغاز کرنا چاہیے۔ لوگوں کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں بلکہ انہیں ہمسائیوں کے طور پر ایک مسلمان، ایک عیسائی یا کسی دیگر شناختی تعصب سے بالاتر ہو کر بطور انسان ایک ساتھ رہنے کا چلن اختیار کرنا ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابیات

1- Abu Sahlieh, Sami A., 2002, *Muslims in the West caught between rights and duties: redefining the separation of Church and State*, Shangri-La Publications, Warren Centre, US.

2- Ahmed, Akbar S. 1993, *Living Islam, From Samarkand to Stornoway*, BBC Books Ltd., London.

3- Anderson, Bennedict, 1991, *Imagined Communities*, Verso, New York.

4- Barry, Brian, 2001, *Culture and Equality: An Egalitarian Critique of Multiculturalism*, Polity Press, Cambridge.

5- Bawer, Bruce *Tolerating Intolerance: The Challenge of Fundamentalist Islam in Western Europe*, posted on 06/06/2003 by Eurowit on www.FreeRepublic.com

6- Bayyah, Sheikh Abdullah bin, 1999, *Muslims Living in Non-Muslim Lands*, Santa Clara Convention Centre, Santa Clara CA, 31st July 1999

7- Bennett, Clinton, 2005, *Muslims and Modernity*, Continuum, London.

8- Finlay, Andrew. (ed.) 2004, *Nationalism and Multiculturalism*, Transaction Publishers, New Brunswick.

9- Glazer, Nathan, 1975, *Affirmative Discrimination Ethnic Inequality and Public Policy*, Basic Books, New York.

10- Gutmann, Amy (ed.) 1994, *Multiculturalism*, Princeton University Press, Princeton.

11- Haddock, Bruce and Sutch, Peter (eds) 2003, *Multiculturalism, Identity and Rights*, Routledge, London.

12- Husain, Mir Zohair, 2003, *Global Islamic Politics*, Addison- Wesley Educational Publishers Inc., New York.

13- Ismail, Salwa, 2003, *Rethinking Islamist Politics: Culture, the State and Islamism*, I.B. Tauris & Co Ltd.,New York.

14- Kelly, Paul (ed.) 2002, *Multiculturalism Reconsidered*, Polity Press, Cambridge.

15- Khadduri, Mahmoud, 1995, *War and Peace in the Law of Islam*, John Hopkins University Press,Baltimore.

16- Khalidi, Tarif, 1992, *Religion and Citizenship in Islam, Religion and Citizenship in Europe and the Arab World*, Grey Seal Books, London.

17- Kymlicka, Will, 1995, *The Rights of Minority Cultures*, Oxford University Press, New York.

18- Maalouf, Amin, 1998, *Les Identites meurtrieres*, (Mortal Identities), Grasset et Fasquelle, Paris.

19- Mac .inri, Piaras in his address *Beyond Tolerance: Towards Irish Models of Multiculturalism?* Merrion Summer School, June 2002

20- Malik,Kahlid *Lecture given at Institut Francais*, London, 16th November 2002

21- Malik, Ihab H., 2004, *Islam and Modernity: Muslims in Europe and the United States*, Pluto Press, London.

22- Masci, David senior research fellow at the Pew Forum on Religion and Public Life, *Tolerating Intolerance: The Challenge of Fundamentalist Islam in Western Europe*, posted on 06/06/2003by Eurowit on www.FreeRepublic.com

23- May, Stephen, Modood, Tariq and Squires, Judith (eds) 2004 *Ethnicity, Nationalism and Minority Rights*, Cambridge University Press, Cambridge.

24- Murphy, Seamus, 2003. "Cultures, Pluralism, and Religious Faith", *Studies Journal*, vol. 92 No. 365 pp. 34-41.

25- Nielsen, Jorgen (ed.) 1992, *Religion and Citizenship in Europe and the Arab World*, Grey Seal Books, London.

26- Niessen, Jan and Schibel, Yongmi, 2004, *Handbook on Integration for Policy-makers and Practitioners*, Migration Policy Group (MPG) for Directorate-General for Justice, Freedom and Security.

27- Parekh, Bhikhu, 2000, *Rethinking Multiculturalism: Cultural Diversity and Political Theory*, Palgrave, New York.

28- Parekh, Bhikhu, *Political Theory and the Multicultural Society*, Radical Philosophy Articles, May/June 1999 Radical Philosophy Ltd. www.radicalphilosophy.com accessed on 22/05/2005

29- Ouardiri, Hisham *Musulman et citoyen europeen: quel avenir? (Muslims and European citizenship: which avenue?)*, Le Courrier newspaper 19/11/1993

30- Rajan, Nalini, 2002, *Democracy and the Limits of Minority Rights*, Sage Publications, New Delhi.

31- Ramadan, Tariq, 1999, *To be a European Muslim*, The Islamic Foundation, Leicester.

32- Ramadan, Tariq, 2004, *Western Muslims and The Future of Islam*, Oxford University Press, NewYork.

33- Rawls, John, 1993, *Political Liberalism*, Columbia University Press, Columbia.

34- Raza, Mohammed, 1991, *Islam in Britain: Past, Present and the Future*, Volcano Press, Leicester.

35- Riordan, Patrick, 2003, "*The Limits of Pluralism*", *Studies Journal* vol. 92 No. 365 pp. 42-50.

36- Scanlon, Tom, 1998, *What We Owe to Each Other*, Harvard University Press, Cambridge MA.

37- Shadid, W.A.R. and Van Koningsveld, P.S. (eds) 1995, *Religious Freedom and the Position of Islam in Western Europe*, Kok Pharos Publishing House, Netherlands.

38- Shadid, W.A.R. and Van Koningsveld, P.S. (eds) 1996, *Muslims in the Margins: Political Responses to the Presence of Islam in Western Europe*, Kok Pharos Publishing House, Netherlands.

39- Taylor, Charles, 2002, *Varieties of Religion Today: William James Revisited*, Harvard University Press, Cambridge, MA.

40- Vanaik, Anvil, 1997, *Communalism Contested: Religion, Modernity and Secularization*, Vistaar Publications, London.

41- West, Patrick, 2004, "The Poverty of Multiculturalism", *Studies Journal*, vol. 94 No. 374 pp. 151-158.

42- Yazbeck, Yvonne Haddad (ed.) 2002, *Muslims in the West: From Sojourners to Citizens*, Oxford University Press, New York.

43- Newspapers The Guardian, London

44- Websites:

www.bbc/talkingpoint.co.uk accessed 10/08/2005
www.ecre.org accessed on the 13/08/2005
www.FreeRepublic.com accessed 10/08/2005
www.openDemocracy.net accessed 12/07/2005
www.radicalphilosophy.com accessed 22/05/2005

© rasailojaraid.com